ملی مسائل اور ہماری بے حسی

"**بزمِ دانش**" میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم ارباب قلم اور علماے اسلام کو آواز دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ **از: مبارک حسین مصباحی**

اپریل ۲۰۱۰ء کا عنوان — دعوت و تبلیغ کا نبوی اسلوب

مئی ۲۰۱۰ء کا عنوان — اردو ادب کے فروغ میں دینی صحافت کا کردار

سیاست کے میدان میں علماے اہلِ سنت نے ہمیشہ کام کیا ہے

از: مولانا محمد عبد المبین نعمانی قادری، مہتمم دار العلوم قادریہ، چریا کوٹ، مئو

ملی مسائل سے مراد غالباً ہمارے قومی اور عوامی مسائل ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

"عن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال: کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ فالامیر الذی علی الناس راع و ھو مسئول عن رعیتہ والرجل راع علی اہل بیتہ و ھو مسئول عن رعیتہ و عبد الرجل راع علی مال سیدہ و ھو مسئول عنہ الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔" (الادب المفرد للبخاری: باب العبد راع، ص: ۹۲۶)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار نے ارشاد فرمایا: تم میں ہر ایک ذمہ دار ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ تو جو لوگوں پر امیر بنایا گیا وہ ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی قوم کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اور آدمی اپنے گھر والوں کا نگراں ہے، اس سے اس کے گھر والوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور آدمی کا غلام اپنے آقا کے مال کا محافظ ہے تو وہ اس کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔ سن لو! ہر ایک تم میں سے ذمہ دار ہے، تم میں ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے سلسلے میں باز پرس ہوگی۔

یہ حدیث پاک اس قدر جامع ہے کہ اگر اس کے مطابق ہم عمل کرنے لگیں اور اپنی اپنی ذمہ داری نبھانے میں لگ جائیں اور بے حسی کو خیر باد کہہ دیں تو ہمارے معاشرے کے اکثر مسائل حل ہوتے نظر آئیں گے۔ ایک ہائی کمان سے لے کر چپراسی تک کی ساری ذمہ داریوں کا مذکورہ حدیث میں ذکر آگیا ہے اور ہر ایک کو متنبہ کر دیا ہے کہ اس سے اس کی ذمہ داریوں سے متعلق سوال ہونا ہے، باز پرس کی منزل سے گزرنا ہے اور بے حسی، کوتاہی اور غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کے مواخذہ سے دوچار ہونا ہے۔

اب مذکورہ بالا حدیثِ رسول کی روشنی میں جب ہم اپنے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر جگہ کوتاہیوں اور کمیوں کا ایک ڈھیر نظر آتا ہے اور ہماری ہر کل ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ذیل میں چند گوشوں کو پیش کیا جا رہا ہے، ملاحظہ کریں:

گھریلو ذمہ داریاں: گھریلو اعتبار سے ایک باپ پر، وہ نہ ہو تو بڑے بھائی پر، وہ نہ ہو تو دادا پر، وہ نہ ہو تو چچا پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، لیکن ہم میں اکثر انھیں نظر انداز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کھانے کپڑے کی ذمہ داری تو بالعموم لوگ انجام دیتے ہیں لیکن تعلیم اور تربیت کے سلسلے میں غفلت بہت عام ہے، اور اگر تعلیم کے حق میں مستعدی دکھائی جارہی ہے تو تربیت کا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ بچے نماز نہیں پڑھتے، بیوی نماز کے قریب بھی نہیں جاتی، کوئی پوچھنے والا نہیں اور کبھی تو نگرانِ خانہ خود نماز کی اہمیت سے ناواقف اور غافل ہوتے ہیں وہ دوسروں کو کیا تلقین و تاکید کریں گے۔ اس طرح ہمارے اکثر گھروں کا نظام درہم برہم ہے۔ ضرورت ہے کہ گھر کے ذمہ دار حضرات اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں اور انھیں ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کریں ورنہ آوارہ کتوں کی طرح گھومتے پھرتے ہمارے بچے اور طوائف کی طرح گھومتی پھرتی ہماری بچیاں ہمارے لیے وبالِ جان بن جائیں گی، دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں عذاب ہی ہمارا مقدر ہو گا۔

مدارس کی ذمہ داریاں: مدارس کی ذمہ داریاں بھی ہم سے مطالبہ کرتی ہیں کہ ہم ان کے نظام کو درست کرنے کی فکر کریں، جو شعبہ بھی زوال وانحطاط کا شکار ہے اس کو درست کرنے اور لائن پر لگانے کی ذمہ داری ناظمین اور مہتممین کی ہے، اور اگر مالی دشواریاں ہیں تو عوام کو چاہیے کہ اپنی حلال کمائی سے مدارسِ اسلامیہ کا بھرپور تعاون کریں اور اس کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ یوں ہی ذمہ داروں کو چاہیے کہ مالی ضروریات کی تکمیل کے لیے تگ ودو کریں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے صرف قوم کی بے اعتنائی کا شکوہ ہی نہ کرتے رہیں۔ کیوں کہ جہاں قوم میں بے حس لوگ ہیں وہیں ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے مال کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا چاہتے ہیں، لیکن مصارف کا پتہ نہیں چل پاتا۔ اور میں تو دیکھتا ہوں کہ اگر اچھا نظام ہو، اچھی تعلیم وتربیت ہو اور حساب کتاب صحیح رہے تو بہت سے معاونین خود آکر تعاون پیش کرتے ہیں۔

مدارس خاص دینی تعلیم کے لیے قائم کیے جاتے ہیں۔ لیکن اب دیکھا جاتا ہے کہ یہ مدارس تیزی سے دنیاوی اور عصری اسکولوں میں تبدیل ہورہے ہیں جو مدارس کے اصل مقصد کے خلاف ہے۔ ہاں! اگر مدارس کے تحت ایسی عصری درس گاہیں قائم کر دی جائیں جہاں دنیاوی تعلیم کے ساتھ طلبہ واساتذہ میں دینی رنگ پیدا کیا جائے، انھیں صحیح مسلمان بنا کر عصری تعلیم دی جائے۔ ان کے اخلاق و کردار کو بھی درست کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی جائے۔ اسلامی لباس اور اسلامی چہرے بشرے میں رہنے کی تاکید کی جائے اور مذہب پسند دین دار اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ طلبہ واساتذہ سے نمازیں پڑھوائی جائیں تو ان اسکولوں اور عصری درس گاہوں کا قیام جائز ہو سکتا ہے ورنہ خالص دین کے نام پر روپے حاصل کرنا اور انھیں خالص دنیاوی تعلیم پر لگانا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔

یوں ہی بعض مدارس کے تحت چلنے والے اسکولوں میں مخلوط تعلیم دی جاتی ہے اور وہ سب کچھ برائیاں جو سرکاری اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہورہی ہیں یہاں بھی رونما ہورہی ہیں۔ مخلوط تعلیم کی جو برائیاں ہیں وہ ایسی نہیں کہ ان کو سمجھایا جائے۔ ہر با اخلاق انسان انھیں اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا اس برائی کو روکنے کی طرف بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ غالباً یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ آج کل مدارس کی باگ ڈور زیادہ تر غیر مذہبی لوگوں کے ہاتھوں میں جاچکی ہے۔ ایک مولانا صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا کہ جب ہمارے مدرسہ کے عصری شعبے میں جوان لڑکیاں وہ بھی بالکل بے پردہ آنے لگیں تو میں نے کمیٹی کے ذمہ داروں کو بتایا کہ یہ صورتِ حال ایک دینی مدرسہ سے متعلق درس گاہ میں کسی طرح مناسب نہیں، (بلکہ کہیں اور بھی مناسب نہیں) اس کو دور کیا جائے، یا ان بچیوں کو پردے کا پابند بنایا جائے۔ تو مدرسہ کی کمیٹی کے ذمہ دار حضرات مجھ پر برس پڑے اور الٹے مجھے ہی ڈانٹنے اور برا بھلا کہنے لگے۔ اس کو کہتے ہیں "الٹے چور کو توال کو ڈانٹے"۔

یوں ہی ایک میرے سامنے کا گزرا واقعہ ہے۔ میں ایک سفر کے دوران ایک مدرسہ سے گزرا، مدرسہ دیکھنے اور وہاں کے ایک مولانا صاحب سے جن سے میرے مراسم تھے ملنے کے لیے رک گیا۔ ایک صاحب مدرسہ دکھانے لگے اور گیٹ کے بعد درس گاہ کے بالکل آخری حصے میں کمپیوٹر روم تھا، اسے بھی دکھانے کے لیے لے گئے، جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ بہر حال میں گیا۔ جیسے ہی کمپیوٹر روم میں پہنچا، بالکل بے پردہ جوان لڑکیاں کمپیوٹر چلا رہی تھیں اور کمپیوٹر روم بھی شیشے سے بنا ہوا تھا کہ ہر گزرنے والا بہ آسانی ان کو دیکھ اور ملاحظہ کر سکے۔ میں تو لاحول پڑھتے ہوئے فوراً باہر آ گیا اور سخت نفرت کا اظہار کیا۔ ایسا بھی نہیں کہ وہاں کسی مرد کے آنے جانے پر روک ہو۔ اب یہ بے پردہ جوان لڑکیاں کہ سر پر دوپٹہ نام کی کوئی چیز نہیں، روزانہ گیٹ سے گزر کر کمپیوٹر روم تک آتی جاتی ہیں تو بھلا وہاں رہنے والے اساتذہ اور طلبہ پر کیا اثر پڑے گا اور

وہاں کاماحول کیسے پاکیزہ رہ سکے گا۔ یہ بات کوئی ایسی نہیں کہ اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہو۔ کمپیوٹر اور بچیوں کی تعلیم کے فروغ کے نام پر اس طرح کے فحش مناظر اور بھی کئی مدارس میں سننے کو ملے ہیں۔ اب یہ بات کس قدر قابل افسوس ہے کہ جو مدارس دینی احکام و مسائل کی تبلیغ و تعلیم ہی کے لیے قائم ہوئے وہیں دین کی قدروں کو اس بے دردی کے ساتھ پامال کیا جائے گا تو آخر دین کہاں باقی رہے گا؟ گویا:

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

میں دینی مدارس میں عصری تعلیم کا مخالف نہیں ہوں بلکہ اس دور میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ مدارس کے تحت عصری درس گاہیں قائم کی جائیں تاکہ ہمارے مسلمان بچے اور بچیاں دوسرے عمومی اسکول اور کالج کے گندے ماحول سے بچ کر دینی ماحول میں دنیاوی تعلیم حاصل کریں اور بڑی بچیوں کے لیے باپردہ تعلیم کا انتظام ہو تاکہ ان کی عفت و عصمت محفوظ رہ سکے تو ہر ایک کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم اور دینی تربیت کا بھی بھرپور انتظام ہو۔

سیاسی بیداری: سیاست کے میدان میں علماے اہلِ سنت نے ہمیشہ کام کیا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے تو بہت سے علما قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے، حضرت صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی، سب میں پیش پیش رہے، ان کے علاوہ علامہ سید سلیمان اشرف بہاری خلیفۂ اعلیٰ حضرت، برہانِ ملت حضرت علامہ برہان الحق جبل پوری، محدث اعظم ہند علامہ سید محمد کچھوچھوی علیہم الرحمۃ والرضوان کے بڑے کارنامے ہیں۔ ملک العلما مولانا محمد ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ نے ''سدّ الفرار عن مہاجری بہار'' لکھ کر اور حضور حافظ ملت علامہ شاہ حافظ عبد العزیز محدث مراد آبادی بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے ''ارشاد القرآن'' اور ''الارشاد'' لکھ کر اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا اور تقسیم کے وقت ملک چھوڑ کر بھاگنے والوں کو روکا اور ان کی ناعاقبت اندیشی کو اجاگر کیا۔ محسنِ ملت مولانا شاہد علی فاروقی علیہ الرحمہ نے بھی بھرپور طریقے سے سیاست میں حصہ لیا اور حق گوئی کی پاداش میں جیل تک کے مصائب برداشت کیے۔ حضرت صدر الشریعہ اعظمی مصنف ''بہارِ شریعت'' نے بھی علی گڑھ میں مسٹر جناح کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کی اور انگریزوں کے ساتھ مشرکین سے بائیکاٹ کی بھی تجویز پیش کی۔ حضرت برہان ملت مولانا شاہ مفتی محمد برہان الحق جبل پوری علیہ الرحمہ نے جنگِ آزدی میں بھرپور حصہ لیا اور پھر مسٹر جناح کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں ان کا ساتھ دیا۔ حتی کہ ایک میٹنگ میں جو اس لیے منعقد کی گئی تھی کہ اگر پاکستان کی تجویز پاس ہوگئی اور علاحدہ ملک مل گیا تو اس ملک کا نام کیا رکھا جائے گا تو اس سلسلے میں کئی ناموں کی تجویز کے بعد حضرت برہانِ ملت نے فرمایا، کہ میں نے کہا اس کا نام ''پاکستان'' ہونا چاہیے۔ تو جناح نے اس کو قبول کرتے ہوئے مٹھی بندھے ہاتھ کو زور سے ٹیبل پر مارا اور کہا Very Good Name۔ یہ بات براہِ راست حضرت برہانِ ملت نے ایک انٹرویو کے دوران فرمائی۔ یہ واقعہ عرسِ چہلم حضور مفتی اعظم ہند (علیہ الرحمہ) کا ہے۔ میرے ساتھ اس وقت حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب، مولانا افتخار احمد اعظمی اور مولانا یٰسین اختر مصباحی بھی تھے۔ وہ انٹرویو اشاروں میں کیا گیا تھا، بروقت مرتب نہ ہو سکا اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اب اس کی تلاش اور ترتیب دونوں مشکل ہے۔ لیکن حضرت کا مذکورہ بالا بیان اچھی طرح یاد ہے۔ عوام میں بھی بہت سے بیدار ذہن سنی حضرات تھے، جنھوں نے بڑھ کر سیاست میں حصہ لیا۔ جناب نصرت اللہ عباسی (ممبئ) کا نام مجھے یاد ہے۔ ان کے علاوہ متعدد علاقوں میں بہت سے سنی حضرات وہ تھے جو بڑھ چڑھ کر سیاست میں دخیل تھے۔ البتہ مبتذل سیاست ہمارے علمانے کبھی پسند نہیں کی۔ مساجد میں مشرکین سے تقریر کرانے والی سیاست، اپنا دین و مذہب کافر لیڈروں کے ہاتھ گروی رکھنے کی سیاست سے ہمارے علماے دین و مشائخ ہمیشہ دور رہے اور اگر کسی کے پاؤں سیاست میں پھسلے تو ہمارے اکابر نے ہمیشہ اس کا سخت نوٹس لیا اور جو شرعی حکم ان پر لگ سکتا تھا وہ لگایا، کوئی رورعایت نہیں برتی۔

تقسیم ہند کے بعد البتہ تمام مسلمان افراتفری کا شکار تھے۔ بہت سے وہ علما جو پہلے پاکستان کے حامی تھے، ہندوستان تقسیم ہو جانے کے بعد یہاں کی سیاست میں سرگرم نہیں رہے۔ کچھ خوف اور کچھ مصلحت نے ان کو دور رہنے پر مجبور کیا۔ لیکن جب تقسیم کے ہنگامے فرو ہوئے اور

نازک صورت حال سے نجات ملی تو پھر الحمد للہ علماے اہلِ سنت نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں، جیسا کہ اچھی طرح ہمیں معلوم ہے کہ قائدِ اہلِ سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ، مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی علیہ الرحمہ، مولانا سید شاہ اسرار الحق شاہ جہانپوری، مجاہدِ ملت مولانا حبیب الرحمٰن عباسی، مولانا ریحان رضا خان رحمانی میاں، سجادہ نشیں آستانہ رضویہ بریلی شریف۔ اور موجودہ حضرات میں خطیب الہند مولانا عبید اللہ خاں اعظمی سابق ممبر پارلیمنٹ، مولانا محمد ادریس بستوی نائب ناظم الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، مولانا مفتی محمد قاسم ابراہیمی تیغی، مولانا ڈاکٹر محمد محب الحق اعظمی وغیرہ۔ ان کے علاوہ عبد العلی عزیزی، وقار احمد عزیزی (مہاراشٹر) وغیرہ۔ اور قلمی سیاست میں حصہ لینے والے علما میں مولانا یٰسین اختر مصباحی، مولانا مبارک حسین مصباحی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ علاقائی وضلعی پیمانے پر بہت سے علما اور ذمہ دار حضرات ایسے ہیں جو اپنے اپنے طور پر سنیوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ البتہ سب کا انداز الگ الگ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مزید پیش رفت ہونی چاہیے اور ایک متحدہ محاذ بننا چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہماری مساعی رائیگاں ہو جاتی ہیں۔ ماضی میں مسلم متحدہ محاذ اور مسلم پرسنل لا کانفرنس کے ناموں سے دو ایسی تنظیمیں وجود میں آئیں جن کا باقی رہنا ضروری تھا لیکن افسوس کہ ان دونوں کا وجود قصہ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ البتہ ہماری چند تنظیمیں کل ہند جماعت رضاے مصطفیٰ، آل انڈیا سنی جمیعۃ العلما، سنی تبلیغی جماعت راجستھان، آل انڈیا تبلیغ سیرت زندہ ہیں، فعال ہیں۔ اگرچہ انھیں اور فعال ومتحرک ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ تنظیموں اور جماعتوں کی بھیڑ میں "رضا اکیڈمی" کا بھی نام آتا ہے جو اپنے اکیڈمک نام کی وجہ سے تنظیم وجماعت سے باہر معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس وقت پوری جماعت اہلِ سنت کی نمائندگی کر رہی ہے جس کی شاخیں صرف ہند ہی نہیں بیرونِ ہند بھی اس نام سے کئی اکیڈمیاں بن چکی ہیں اور حرکت وعمل کا احساس دلا رہی ہیں، جس کے روحِ رواں اور سرگرم قائد ہیں جناب الحاج محمد سعید نوری جو اس اکیڈمی کے بانی بھی ہیں۔ اہلِ سنت کے تعلق سے ملک وبیرون ملک کہیں کوئی معاملہ ہوتا ہے "رضا اکیڈمی" اپنے وجود کو منوانے میں لگ جاتی ہے۔ معاملہ ریلیف فنڈ کا ہو یا اسلام وپیغمبرِ اسلام یا سنیت کے خلاف کسی سازش کا۔ یہ اکیڈمی سب کے خلاف علمِ احتجاج بلند کرنے میں سب سے آگے رہتی ہے۔ ریلیف کا تو یہ حال ہے کہ امریکہ نے جب عراق پر دہشت گردانہ اور ظالمانہ حملہ کیا تو تمام مسلم ممالک خاموش تماشائی بنے رہے اور کئی ایک نام نہاد مسلم حکومتیں ان انسانیت سوز حملوں میں اپنے دادا امریکہ کے شانہ بشانہ کھڑی ہو کر اس کے گڑے پنجوں کو اور مضبوط کرنے کی کوشش میں لگ گئیں اور اس وقت پوری دنیا کا مسلمان تڑپ اٹھا، مگر کوئی کچھ نہ کر سکا۔ غم وآلام کی اس کڑی دھوپ میں وہ سعید نوری تھے اور ان کی رضا اکیڈمی جو عراق کی مدد کے لیے کھڑی ہو گئی اور پوری دنیا نے پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ سعید نوری صاحب عراق کے مظلوم مسلمانوں تک اپنی امداد پہنچانے میں کامیاب ہو گئے اور وہ کر دکھایا جو بڑی بڑی تنظیمیں اور حکومتیں نہ کر سکیں۔

ریلیف کے معاملے مین سنامی لہریں ہوں یا گجرات کا زلزلہ یا پھر گجرت کا بھیانک اور ریکارڈ توڑ فساد، جس نے ملک کی جمہوریت کو ننگا کر کے رکھ دیا تھا۔ ان بھیانک ماحول میں رضا اکیڈمی نے بھرپور ریلیف پہنچائی۔ اکثر فسادات، سیلاب اور زلزلے کے موقع پر علماے اہلِ سنت معاشی تنظیمیں اور اہلِ ثروت حضرات بھی ریلیف اور راحت رسانی کے کارنامے انجام دیتے ہیں لیکن ان کا پروپیگنڈہ اور اشتہار نہیں ہوتا۔ اس میں میڈیا بھی کچھ تعصب برتتی ہے تو ہماری غفلت بھی ساتھ دے دیتی ہے کہ بڑے بڑے کارنامے ہم اہلِ سنت انجام دے ڈالتے ہیں لیکن اعلان واشتہار میں پیچھے رہ جاتے ہیں، جب کہ اس زمانے میں اشتہار ایک بڑی چیز بن چکا ہے۔ لیکن افسوس ہمارے اپنے حضرات اسٹیج سجانے میں تو لگ جاتے ہیں اور اس پر ڈھیروں رقمیں ایک دو شب کے لیے خرچ کر ڈالتے ہیں، لیکن پبلی سٹی اور رپورٹ شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے جس کی وجہ سے ہی ہمارے بڑے بڑے نمایاں کام بس ایک مخصوص حلقے میں اپنا جلوہ دکھا کر گم نامی کی نیند سو جاتے ہیں اور ہم خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بڑا جشن کر لیا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے بہت سے اہم کام محض شخصی اور مقامی انجمنوں کی طرف منسوب ہو کر رہ جاتے ہیں جب کہ دوسری جماعتیں اپنے معمولی کاموں کو بھی اپنی مرکزی تنظیموں سے جوڑ کر عوام میں سرخروئی حاصل کر لیتی ہیں، اس لیے مرکز سے جڑنے اور اپنے ذاتی ناموں کی قربانی دینے کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی اپنے کو اونچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ اس سے ہمارا جماعتی کام دب کر رہ جاتا ہے۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی خدمت میں ایک مرتبہ اپنی جماعتی سرگرمیوں کے بارے میں تبصرہ ہوا کہ ہر میدان

میں ہم بہت پیچھے ہیں۔ تو فرمایا: ”نہیں! ہم پیچھے نہیں ہیں، ہم بہت آگے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ دوسرے لوگ پروپیگنڈہ زیادہ کرتے ہیں اور ہم اپنے کاموں کا پروپیگنڈا نہیں کرپاتے، ہم صرف پروپیگنڈے میں پیچھے ہیں کام میں نہیں۔“

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی سوچ مثبت تھی اور ہمیشہ حوصلہ افزائی سے کام لیتے تھے اور آج ہم ہمیشہ منفی فکروں کو سہارا بناتے ہیں۔ حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ نے الجامعۃ الاشرفیہ جیسا عظیم الشان ادارہ بناڈالا، جس کی اہمیت کو آج وہ بھی محسوس کرتے ہیں کل جو ان کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے بلکہ مخالفت کرتے تھے۔ لیکن دیکھا گیا کہ حافظِ ملت علیہ الرحمہ کہیں یہ نہیں فرماتے کہ میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا، یہ تیر مارا، وہ تیر مارا، میں نے وہ کیا جو کسی نے نہ کیا، فلاں ایسے ہیں فلاں ویسے ہیں۔ حافظِ ملت کا یہی طرزِ عمل اور یہی فکر تھی جس نے ان کو اور ان کے ادارے کو بامِ عروج پر پہنچادیا اور ان کے کام کو اتنا بلند کردیا کہ جس کی طرف دیکھنے سے کتنوں کی ٹوپیاں گرجاتی ہیں۔ آج ہم تنقید کی ڈگر پر چل رہے ہیں، جب کہ حضور حافظِ ملت مسلسل تعمیر کی راہوں پر گام زن تھے۔ آج ہم افتراق کی باتیں شوق سے کیا کرتے ہیں جب کہ حضور حافظِ ملت اتحاد کا چرچا کیا کرتے تھے اور ان کے راستوں کو اپناتے تھے جن سے اتحاد کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اپنے جانی دشمنوں اور گالیاں دینے والوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آتے، آج ہمیں ان ہی کی روش پر چلنا چاہیے کہ انھیں کا راستہ کامیابی کا راستہ ہے۔ آج ہم تنظیموں کا رونا روتے ہیں۔ حافظِ ملت، الجامعۃ الاشرفیہ کی شکل میں ایک ایسی تنظیم بناگئے ہیں کہ ہم اس سے جڑجائیں تو سارے مسائل حل ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے تو ایک مرتبہ فرمایا: انشاء اللہ سارا کام الجامعۃ الاشرفیہ سے ہوگا۔ لہٰذا ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت الجامعۃ الاشرفیہ اہلِ سنت و جماعت کی شان ہے، ملک وملت کی بہت ساری ضرورتیں آج اس سے پوری ہورہی ہیں اور انشاء اللہ پوری ہوتی رہیں گی۔ بس ضرورت ہے اخلاص کی، قربانی کی اور جہدِ مسلسل کی، تھوڑا کچھ کرکے، تھک ہار کے بیٹھ رہنا اور پھر شکایات کا دفتر کھول دینا کہ لوگ ساتھ نہیں دیتے، قوم بڑی بے حس ہے، کیا کروں، جی چاہتا ہے میں بھی چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاؤں۔ میں نے اتنا سب کیا میرا کہیں نام نہیں ہے۔ یہ کامیابی کی ضمانت ہرگز نہیں۔ اقبال کا یہ شعر یقیناً اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم | جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اب آخر میں چند تجاویز پیش کی جارہی ہیں۔ امید ہے کہ ان پر ہم میں با اثر افراد عمل کرنے کی کوشش کریں گے اور مایوسی کے اندھیروں سے امید کی کرنیں پھوٹیں گی۔

١- اہلِ سنت و جماعت کا ایک نمائندہ اخبار نکلنا چاہیے۔

٢- عربی اور انگریزی میں بھی تو اخبار نہیں تو ماہ نامے ضرور جاری ہوں۔

٣- ہماری مرکزی تنظیموں میں کسی ایک کو فعال بنایا جائے اور ملک بھر کے سنیوں کو اس سے جوڑا جائے۔

٤- کچھ لوگ آل انڈیا تنظیموں کو وسعت اس لیے نہیں دینا چاہتے کہ کہیں عہدے کا کھاتا کسی اور کے نام نہ کھل جائے، یہ روش ختم ہونی چاہیے۔

٥- چھوٹی چھوٹی تنظیموں اور انجمنوں کو مرکزی تنظیموں سے جوڑ دینا چاہیے یا ضم کردینا چاہیے۔

٦- سب سے زیادہ توجہ ہمیں مدارس کے قیام اور ان کے فروغ پر دینا چاہیے۔

٧- سنی حضرات مراسم کی ادائیگی میں جتنی دل چسپی لیتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ تعلیم کے فروغ پر توجہ دینی چاہیے۔

٨- علما اور مشائخ بالعموم اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے کنارے رکھ رہے ہیں، یوں ہی سنی اہلِ ثروت حضرات بھی اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے دور رکھ رہے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے مدارس بالعموم اولڈ ماڈل ہی چل رہے ہیں، جہاں نہ کھانے کا معقول انتظام، نہ رہائش کا مناسب اہتمام۔ اس کی طرف توجہ بھی بہت ضروری ہے۔ رہائش اور خورد و نوش کے معقول انتظام کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی خیال رکھا جائے تا کہ مولوی بننے کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم اور دنیاوی زبانوں سے بھی ضرورت بھر شغف ہو۔

ہمارے قائدین غفلت کے خول سے باہر آکر ملی مسائل کا جائزہ لیں

از: مولانا محمد ساجد رضا مصباحی، استاذ جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، اوریا

نوشتۂ دیوار پڑھ کر ہوش کے ناخن لینا اور متاعِ کارواں کے لٹ جانے کے بعد احساسِ زیاں پیدا ہو جانا قوموں کے لیے خوش آئند مستقبل کا اشاریہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن حال اور مستقبل سے بے پرواہو کر خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہنا، کسی زندہ دل اور باشعور قوم کا شیوہ نہیں ہوتا۔ آزادیِ ہند کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی ناعاقبت اندیشی اور مسلم قائدین کی خود غرضی اور ابن الوقتی کے سبب پے درپے مسائل کا شکار ہوتے گئے۔ اجتماعی اور ملی مسائل کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ ہر دور میں ہر قوم اور ہر جماعت کے کچھ حساس مسائل اور معاملات ہوا کرتے ہیں، لیکن باشعور قومیں غیر ضروری ہیجان انگیزی وہنگامہ خیزی اور غفلت وتساہلی سے دور رہ کر منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی کے ساتھ اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ مسائل تو پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن ایک زمانے تک مسلمانوں نے گردشِ روزگار کے پیدا کردہ ان مسائل سے آنکھیں چرائیں، مسلم قائدین ذاتی مفادات پر اجتماعی و ملی مفادات کو قربان کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی وقعت وحیثیت کھو بیٹھے اور ایک غفلت شعار و پس ماندہ قوم کی حیثیت سے متعارف ہو گئے۔ لیکن اب صرف اپنی ناکامیوں پر آنسو بہانا سود مند نہیں ہوگا، بلکہ اپنے اندر احساسِ زیاں پیدا کر کے شعور و آگہی اور جذبۂ فراواں کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جانا تلافی مافات کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اس ضمن میں ہمیں سب سے زیادہ شکوہ مسلمانوں کے ان مذہبی وسیاسی قائدین سے ہے جو مذہب وملت کے نام پر مسلمانوں کا استحصال تو کرتے ہیں لیکن انھیں ملی وجماعتی مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ قوم کے خون سے اپنے عشرت کدوں کے قمقمے روشن تو کرتے ہیں لیکن ان بے چاروں کے لیے مٹی کے دیے کا بھی انتظام نہیں ہو پاتا۔

گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن　　　　ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی

ہمارے یہاں قوم وملت کی فلاح وبہبود کے نام پر تنظیموں کی بھی کمی نہیں، لیکن ملی وجماعتی مفاد میں ان کی سرگرمیوں کا دائرہ کتنا محدود ہے، وہ سب پر عیاں ہے۔ قیادت ایک "شوق" بن چکی ہے۔ پہلے "قاضیِ شہر" ہوا کرتے تھے اور اب "قاضیانِ شہر" ہونے لگے ہیں۔ تنظیموں اور بورڈوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے لیکن مسائل کم نہیں ہو رہے ہیں۔ ملی وجماعتی مسائل کے حل کا ہمارے یہاں صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ نتائج اور عواقب کی پروا کیے بغیر سراپا احتجاج بن کر سڑکوں پر اتر آیا جائے اور حکومت کے خلاف چند بلند بانگ نعرے لگا کر اس کی رپورٹ اخبارات کو بھیج دی جائے۔ حکومت تک ہماری آواز پہنچی یا نہیں، ہمارے احتجاج کا کوئی اثر مرتب ہوا یا نہیں، ہمیں اس کی قطعی فکر نہیں ہوتی۔ گویا احتجاج اور جذباتی نعروں کے بعد ہم اپنے آپ کو پوری طرح بری الذمہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اصحابِ فکر ونظر سے مخفی نہیں کہ ہمارے اس رویے نے ہمیں کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ بلاشبہہ ایسا احتجاج اور تجویز جو قوتِ عمل سے عاری ہو اسے زبانی جمع خرچ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی، اور نہ حکومت اسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھتی ہے۔ ابھی حال ہی میں مرکزی مدرسہ بورڈ کا مسئلہ میڈیا میں سرگرم موضوعِ بحث بنا ہوا تھا، حمایت ومخالفت میں اندھا دھند بیانات جاری کیے گئے، دیوبندی مسلک کے قائدین نے اس کی مخالفت میں اپنی پوری طاقت جھونک دی، جب کہ جماعتِ اہلِ سنت کی طرف سے یکا دکا بیانات "فرض کفایہ" کے ادائیگی کے طور پر شائع ہوئے۔ اہلِ سنت کی اکثر تنظیموں اور اداروں کے ذمہ داران اب تک خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ بات عہدے اور قیادت کی ہوتی تو ملک کے طول وعرض سے نہ جانے کتنے "کج کلاہان" سینے میں ملتِ بیضا کا درد لیے میدانِ کارزار میں بے خطر کود پڑتے اور اسے ملت کا سب سے اہم ایشو بنا کر حمایت ومخالفت کا طوفان کھڑا کر دیتے، کانفرنسیں ہوتیں، کتابچے چھاپے جاتے اور وہ سب کچھ ہوتا جس کی امید ہمارے مخالفین ہم سے رکھتے ہیں۔

جماعتی و ملی مسائل میں صرف اخباری بیانات اور اظہارِ خیالات سے بھی کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکتا، اس کے لیے ہمیں اجتماعی طور پر سنجیدہ کوششیں کرنی ہوں گی اور ٹھوس دلائل کے ساتھ اپنے مطالبات، اپنی ضروریات اور اپنا موقف حکومت کے سامنے رکھنا ہو گا۔ اس ضمن میں خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کا یہ اقدام قابلِ مبارک باد اور خوش آئند ہے کہ امسال عرسِ قاسمی کے موقع پر مرکزی مدرسہ بورڈ کے مسئلے کو "فکر و تدبر کانفرس" میں موضوعِ بحث بنایا گیا اور مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد جماعت کے سرکردہ علما اور دانش وروں کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی نے مرکزی مدرسہ بورڈ کے مسودے کا بغور مطالعہ کیا اور مختلف دفعات میں ترمیم و اصلاح کے بعد اسے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل کو پیش کیا، اس سنجیدہ کوشش کا کیا اثر مرتب ہوا اس کا اندازہ وزیرِ موصوف کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔

"یہ ایسا پہلا موقع ہے جب مسلمانوں کا ایک باشعور طبقہ مجھ سے ملاقات کر کے مرکزی مدرسہ بورڈ میں ترمیم کے ساتھ اپنی منظوری دینے کی اپیل کر رہا ہے، ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ترمیم کے حوالے سے پیش کی گئی آپ کی تجاویز پر غور کیا جائے گا۔"

اس ضمن میں الجامعۃ الاشرفیہ اور تنظیم ابنائے اشرفیہ کی کوششیں بھی قابلِ تحسین ہیں۔ یقیناً خانقاہ برکاتیہ اور الجامعۃ الاشرفیہ کا یہ تاریخی اقدام قابلِ تقلید ہے۔

رنگ ناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی جاچکی ہے، سیاسی ماہرین اس رپورٹ کو آزاد ہندوستان بلکہ ۱۸۵۷ء سے اب تک کی تاریخ کا سنگ میل قرار دے رہے ہیں، اس رپورٹ میں دو باتیں بڑی اہم کہی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں کا دس فی صد حصہ مسلمانوں کا ہونا چاہیے۔ دوسری یہ کہ ملک میں جس سطح پر بھی دلت کوٹہ مقرر ہوا ہے وہ کوٹہ بلا تفریق تمام دلتوں میں لاگو ہونا چاہیے۔ یعنی ابھی تک آئینی اعتبار سے دلت کوٹے کے مستحق محض ہندو دلت تھے، لیکن رنگ ناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ کے مطابق دلت کوٹے کے مستحق مسلم اور عیسائی دلت بھی ہوں گے۔ اس پس منظر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر مشرا کمیشن رپورٹ من وعن لاگو کر دی گئی تو چند دہائیوں میں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے مسلمانوں میں انقلاب آسکتا ہے۔ لیکن کیا اس رپورٹ کے نفاذ کی راہیں ہموار ہوسکیں گی؟ اور بی. جے. پی. اور اس کی ہم نوا جماعتیں کہرام بپا نہیں کریں گی؟؟ کیا سنگھ پریوار کا ردِ عمل منفی نہیں ہو گا؟؟؟ اب مسلم قیادت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس رپورٹ کے نفاذ کے لیے حکمتِ عملی اور سوجھ بوجھ سے کام لے۔ اگر اس سلسلے میں مسلم زعما اور تنظیمیں آئینی حدود میں رہ کر جدوجہد کرتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ممکنہ خطرات ٹل جائیں اور حکومت اس پر اپنی مہر ثبت کر دے، بس ضرورت ہے بیداری کی۔

لبراہن کمیشن کی رپورٹ بھی ایک طویل عرصہ کے بعد پارلیمنٹ میں پیش کی جاچکی ہے اور شور و ہنگامہ کے سبب اس پر بحث کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ مسلم دشمن عناصر اس رپورٹ کو بھی سرد خانے میں ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے، اس لیے ہمیں پوری طرح چوکنا رہنا ہو گا اور بنیادی حقوق کے حصول کے لیے قانونی طور پر جدوجہد کرنی ہو گی، ہماری ذرا سی غفلت اور تساہلی ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

ملی و جماعتی مسائل کے حل کے لیے ہماری انفرادی کوششیں موثر نہیں ہوسکتیں بلکہ اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہمارے قائدین اپنی بے حسی اور غفلت کے خول سے باہر آکر ملت کے درپیش مسائل کا جائزہ لیں اور ان کے حل کی راہیں تلاش کریں۔ یہ سچ ہے کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد مسلمانوں میں بیداری کی لہر آئی ہے اور غفلت کی چادر آہستہ آہستہ کھسک رہی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خوش آئند ہے۔

ماہ نامہ اشرفیہ حاصل کریں

بنارس میں	ہزاری باغ میں	ہوڑہ میں
جناب الحاج ابرار احمد صاحب	قاری محمد ہاشم صاحب، بھورانی جگد مبا مارکیٹ	عزیزی کوریر اینڈ کارگو سروس
عزیزی جنرل اسٹور، پیلی کوٹھی، بنارس یو.پی.	جی.جی.ایس. روڈ، ہزاری باغ، جھارکھنڈ	256/B/1 Belailes Road, Howrah-1